پنجاب یونیورسٹی کا شعبۂ لائبریری سائنس ☆

(یادوں کے آئینے میں)

از سید جمیل احمد رضوی ☆☆

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

انسان جب ماضی کے آئینے میں جھانکتا ہے تو اس کو بہت سے مناظر نظر آتے ہیں۔ ان کا تعلق ان مراحل کے ساتھ ہوتا ہے جن سے وہ گزرا ہوتا ہے۔ یہ بچپن سے شروع ہوتے ہیں، پھر ان کا دائرہ پھیلتا جاتا ہے۔ اگر تعلیم کے حوالے سے بات کی جائے تو اس میں ابتدائی تعلیم کے حصول سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک کے مدارج آتے ہیں۔ ''یادِ ایام'' یا ''یادِ ماضی'' (Nostalgia) بالعموم حسین یادوں کو لیے ہوئے ہوتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض مناظر ناخوشگوار ہوں۔ انسانی نفسیات ایسی واقع ہوئی ہے کہ عالمِ پیری میں پرانی باتیں یاد رہتی ہیں اور نئی باتیں اکثر لوحِ ذہن سے جلد محو ہو جاتی ہیں۔ اس عالم میں اس کو ماضی عام طور پر حسین ہی نظر آتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے کہا ہے:۔

کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو
کھٹک سی ہے جو سینے میں غمِ منزل نہ بن جائے !

ڈپلوما کا سیشن (۱۹۶۲ء۔۱۹۶۳ء)

میں جب اپنے حصولِ تعلیم کے مراحل پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے وہ دور بہت خوشنما نظر آتا ہے جب میں نے چار سال گورنمنٹ کالج فیصل آباد (موجودہ جی۔سی۔یونیورسٹی، فیصل آباد) میں گزارے۔ میں نے وہاں سے ۱۹۶۱ء میں بی۔اے (آنرز) کا امتحان پاس کیا۔ پھر چند ماہ کے لیے ایم۔بی۔ہائی اسکول، ناندلیانوالہ (ضلع فیصل آباد) میں پڑھایا۔ ستمبر ۱۹۶۲ء میں، مَیں نے ڈپلوما اِن لائبریری سائنس میں داخلہ لیا۔ اس وقت یہ شعبہ اولڈ کیمپس میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا ہی ایک حصہ تھا۔ اس شعبہ کے صدر/چیئرمین یونیورسٹی لائبریرین (موجودہ چیف لائبریرین) ہوتے تھے۔ داخلے کا واقعہ بہت دلچسپ ہے۔ میں نے اس کو اپنی کتاب: ''عبدالوہاب خاں سلیم (پیکرِ جود و عطا)'' میں لکھا ہے۔ یہ اس لیے بھی اہم ہے کہ اس موقع پر لائبریری میں میری پہلی ملاقات ایک ایسے شخص سے دلچسپ پیرائے میں ہوئی جو بعد میں امریکہ چلے گئے اور پھر برصغیر پاک و ہند میں ان کا نام اردو ادب کی دنیا میں شہرت کی بلندیوں تک پہنچ گیا۔ اس واقعہ کا اقتباس اپنی اسی کتاب سے ذیل میں درج کرتا ہوں:۔

> ۱۹۶۲ء میں شعبہ لائبریری سائنس، جامعہ پنجاب، لاہور میں ڈپلوما اِن لائبریری سائنس میں داخلے کے لیے درخواست دی۔ اُنہی دنوں ایک کام کے سلسلے میں لاہور آیا۔ اس کلاس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے

☆ اب اس شعبے کو Information Management کہا جاتا ہے۔

☆☆ سابق چیف لائبریرین، پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور

کے لیے لائبریری میں آیا۔ جب میں نے لائبریری کا جھالی والا صدر دروازہ کھولا تو سامنے کاؤنٹر پر سٹاف کے دو ارکان بیٹھے تھے۔ ایک سے میں نے مذکورہ معلومات کے لیے سوال کیا تو دوسرے صاحب جلدی سے گویا ہوئے: ''مجھ سے پوچھیں میں امرنیشل ہوں''۔ میں نے ان کی طرف غور سے دیکھا، وہ صاحب چشمہ لگائے ہوئے پینٹ اور شرٹ میں ملبوس تھے، کھلی پیشانی، کتابی چہرہ، موٹی آنکھیں اور سفید رنگ کے حامل تھے۔ میں نے اپنا سوال دہرایا۔ بائیں ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگے کہ وہ سامنے دیکھیں، ایک صاحب وارث نامی بیٹھے ہیں۔ وہ بھی فیصل آباد کے رہنے والے ہیں۔ ان سے ملیں، وہ آپ کو مطلوبہ معلومات فراہم کریں گے۔ میں وارث صاحب، جو کہ اس وقت ڈائرسٹ (Diarist) تھے، سے ملا اور اپنا تعارف کرواتے ہوئے استفسار کیا۔ انہوں نے ریکارڈ دیکھ کر کہا کہ آپ کو امرویو کے لیے کال فیصل آباد کے پتے پر ارسال کر دی گئی ہے۔ یہ بھی بتایا کہ داخلے کے لیے امرویو کال ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا لیٹر کے بغیر امرویو دیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے ایک کیبن (Cabin) کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ وہاں جی۔ آر شاہ صاحب (غلام رسول شاہ صاحب، م ۱۹۷۴ء) بیٹھے ہیں۔ اس سلسلے میں ان سے پوچھیں۔ چنانچہ میں ان کے دفتر میں گیا۔ انہوں نے مجھے کہا کہ آپ کل امرویو کے لیے آجائیں۔ اگر ریکارڈ کے مطابق آپ کو کال گئی ہے، تو اس کا ساتھ لانا ضروری نہیں۔ چنانچہ میں اگلے روز امرویو دینے والوں میں شامل ہو گیا۔ امرویو ہوا، غالباً اگلے روز نوٹس بورڈ پر داخل ہونے والے امیدواروں کی فہرست لگا دی گئی۔ اس میں راقم السطور کا نام بھی شامل تھا۔(۱)

یہاں یہ بتانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جن صاحب نے مجھے وارث نامی صاحب کے پاس بھیجا تھا، ان کا نام عبدالوہاب خاں سلیم ہے۔ انھوں نے ۱۹۵۹ء میں ڈپلوما اِن لائبریری سائنس میں داخلہ لیا تھا۔ ۱۹۶۰ء میں ڈپلوما کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔ ان کو اسی سال پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں سروس مل گئی۔ وہ ۱۹۶۲ء میں کاؤنٹر اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ وہاب صاحب نے ۱۹۷۰ء کے عشرے کے اوائل میں کراچی یونیورسٹی سے ایم۔اے (لائبریری سائنس) کی ڈگری لی۔ وہ ۱۹۷۳ء میں امریکہ چلے گئے اور آج کل نیویارک میں مقیم ہیں۔ یہاں اس امر کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۵۹ء میں ڈپلوما اِن لائبریری سائنس کی پہلی کلاس کا داخلہ ہوا تھا۔ اس سے پہلے سرٹیفکیٹ اِن لائبریری سائنس کلاس کی تدریس ہوتی تھی۔ سرٹیفکیٹ میں چار کورسز (پیپرز) پڑھائے جاتے تھے جب کہ ڈپلوما کی کلاس میں پانچ پیپرز کر دیے گئے۔ اس طرح ڈپلوما کی پہلی کلاس کا رزلٹ ۱۹۶۰ء میں نکالا گیا۔

۱۹۶۲ء میں ڈپلوما کلاس میں تیس طلبہ/ طالبات داخل کیے گئے۔ ان میں سے ایک صاحب چند روز کے بعد چھوڑ گئے۔ بیس کے قریب طلبہ تھے اور باقی طالبات۔ میں نے ایک مضمون میں اس کمرے کا ذکر کیا ہے جس میں یہ کلاس ہوا کرتی تھی:۔

> کلاس کے لیے ایک مختصر سا کمرہ تھا جس میں مشکل سے تیس طلبہ/ طالبات بیٹھ سکتے تھے۔ یہ جامعہ کے علامہ اقبال کیمپس (اولڈ کیمپس) پر موجود لائبریری کی پرانی عمارت کی پہلی منزل پر واقع تھا۔۔۔ اس میں داخلے کے دروازے کے باہر لائبریری کا کھلا برآمدہ تھا جس کو نیم کے ایک قدیم درخت کی شاخیں چھوتی تھیں۔ لائبریری کی عمارت کے باہر نیم کے درخت فضا کو پاک و پاکیزہ رکھتے تھے اور لائبریری کے اندر نوادرات و مخطوطات کی حفاظت کے ذمہ دار تھے۔(۲)

میرے کلاس فیلوز کے چند نام یہ ہیں: ملک بشیر علی خان، جی۔ ڈی۔ شاہ، محمد حنیف شاہد، ہیرلڈ جوناتھن، ایس۔ ایم۔ عبدالحی، منذر

حسین شاہ، عبدالرحمٰن، معصوم علی شاہ، اعجاز بھٹی، محمد نیاز، ودیگر۔ ملک بشیر علی خان صاحب نے پہلے پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں سروس اختیار کی۔ پھر ایشیا فاؤنڈیشن کی جانب سے سکالرشپ ملا۔ اس کے نتیجے میں انھوں نے کراچی یونیورسٹی سے ایم۔اے (لائبریری سائنس) کی ڈگری حاصل کی۔ پھر ملک صاحب آسٹریلیا سے بھی ایم۔اے کی ڈگری لے کر آئے۔ بعد میں اس شعبے کے تدریسی اسٹاف میں شامل ہو گئے۔ شعبے کے چیئرمین کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے۔ بعد ازاں سعودی عرب چلے گئے۔ پھر امریکہ میں بھی سروس کرتے رہے۔ اِن دِنوں لاہور میں مقیم ہیں۔ ان سے دو تین بار شعبے میں ملاقات بھی ہوئی ہے۔

ہمارے سیشن میں پڑھانے والے اساتذہ کے نام یہ ہیں: اے۔ رحیم صاحب (عبدالرحیم صاحب، م ۸۔ فروری ۲۰۱۱ء)، غلام رسول شاہ صاحب (م ٦۔ دسمبر ۱۹۷۴ء)، خواجہ نور الٰہی صاحب (م ۱۹۔ جنوری ۱۹۷۴ء) اور امریکی فل برائٹ پروفیسر مس شمٹ (Schmidt)

رحیم صاحب یونیورسٹی کے لائبریرین تھے۔ اس حوالے سے صدر شعبہ بھی تھے۔ جب ہمارا داخلہ ہوا تو وہ کینیڈا گئے ہوئے تھے۔ دو ڈھائی ماہ کے بعد واپس آئے۔ انھوں نے ہمیں انتظامیات (Administration) کا پرچہ پڑھانا شروع کیا۔ وہ انگریزی میں پڑھاتے تھے اور بہت خوبصورت انگریزی بولتے تھے۔ انھوں نے قیامِ پاکستان سے پہلے ایف۔سی کالج لاہور سے ایم۔اے (انگریزی) کی ڈگری لی ہوئی تھی۔ ان کا لیکچر بہت دلچسپ ہوتا تھا۔ دورانِ تدریس لطائف وظرائف بھی سناتے جاتے تھے۔ اس طرح وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ لیکچر میں طلبہ/ طالبات کی دلچسپی قائم رہتی تھی۔ ان کو اردو کے اشعار بھی یاد تھے اور وہ ان کا برمحل استعمال کرتے تھے۔ فارسی بھی پڑھے ہوئے تھے۔ ان کو پنجابی زبان وادب سے بھی لگاؤ تھا۔ ان کی دفتری ڈرافٹنگ (Drafting) کا بہت شہرہ تھا۔[۳]

جب رحیم صاحب لیکچر دینے کے لیے کلاس روم میں آتے تھے، تو پوری تیاری کے ساتھ آتے تھے۔ ایک روز ایسا ہوا کہ ان کے لیکچر کے وقت کی غیر یقینی صورت حال تھی۔ ہم دو طالب علم کلاس روم کے ساتھ ملحق ان کے دفتر میں گئے تو دیکھا کہ وہ اکیلے بیٹھے ہوئے ہیں اور متعلقہ نصابی کتاب کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ ہمیں دیکھ کر کہنے لگے کہ آپ کلاس روم میں چلیں، مَیں تھوڑی دیر کے بعد آتا ہوں۔ ان کی تدریس کے دوران ایک اور بات بطورِ خاص دیکھی جاتی تھی کہ اگر کوئی طالب علم جمائی لیتا تھا تو وہ اس کو بہت ناپسند کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ معلوم ہوتا ہے کہ طالب علم کا لیکچر کی طرف دھیان نہیں ہے۔ یہ صورت حال اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب لیکچر کی طرف پوری توجہ نہ ہو۔

خواجہ نور الٰہی صاحب بہت وضعدار شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا صاف رنگ، کتابی چہرہ، رعب دار آواز، اور لباس بھی صاف ستھرا ہوتا تھا۔ ان کی شخصیت بہت پرکشش تھی۔ نظیری نیشاپوری نے کہا ہے:۔

ز فرق تا قدمش ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا ست

ان کے پڑھانے کا انداز بھی الگ تھا، اس میں شفقت کا پہلو نمایاں ہوتا تھا۔ ہماری ڈپلوما کی کلاس میں پہلا لیکچر انھوں نے دیا تھا۔ اس میں انھوں نے شعبے کا تعارف کروایا تھا اور لائبریرین شپ کے پروفیشن کی اہمیت بیان کی تھی۔ وہ درجہ بندی (Classification) کا پیپر پڑھاتے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ وہ درجہ بندی کے لیے چند کتابوں کے عنوانات لکھوا دیتے تھے۔ جب ان کی اگلی کلاس ہوتی تھی تو طلبہ/ طالبات سے ان کے درجہ بندی کے نمبر پوچھتے تھے۔ اگر ایک عنوان کے مختلف نمبر لگائے ہوتے تھے تو وہ طالب علم سے پوچھتے تھے کہ تمھارے نزدیک اس عنوان کا موضوع (Subject) کیا ہے۔ اگر وہ کہتا کہ میں نے اس کتاب کا فلاں موضوع سمجھا ہے۔ اس لیے میں نے ڈیوی اعشاریائی درجہ بندی نظام کا یہ نمبر لگایا ہے۔ اس پر خواجہ صاحب کہتے کہ تمہارا نمبر درست ہے۔ اگر کوئی دوسرا طالب علم کوئی اور نمبر

بتانا اور موضوع کی تفہیم کی صحیح توجیہ کرنا تو خواجہ صاحب کہتے تھے کہ آپ کا نمبر بھی درست ہے۔ فرمایا کرتے تھے کہ وجہ بندی میں اصل کام موضوعی تجزیہ (Subject Analysis) کا ہوتا ہے۔ اگر تم نے اس کو صحیح سمجھ لیا تو وجہ بندی کا عمل درست تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ اس طریق تدریس سے طلبہ/ طالبات کے اندر خود اعتمادی پیدا ہوتی تھی اور ان کا حوصلہ بڑھتا تھا۔

خواجہ صاحب بہت دور اندیش اور بالغ نظر استاد تھے۔ تدریس ان کا جزوقتی کام تھا۔ وہ پنجاب پبلک لائبریری (موجودہ گورنمنٹ پنجاب پبلک لائبریری) میں لائبریرین (موجودہ چیف لائبریرین) تھے۔ جب ہماری ڈپلوما کلاس کا رزلٹ آیا تو ملک بشیر علی خان صاحب فسٹ کلاس فسٹ تھے اور راقم السطور فسٹ کلاس سیکنڈ تھا یعنی یونیورسٹی میں میری دوسری پوزیشن تھی۔ رزلٹ کے بعد طلبہ جاب کی تلاش میں ہوتے ہیں۔ ایک روز میں پنجاب پبلک لائبریری گیا۔ خواجہ صاحب سے میں نے کہا کہ آپ کی لائبریری میں بھی چند آسامیاں/سیٹیں خالی پڑی ہیں۔ انہوں نے ایک تاریخی جملہ کہا: "بیٹا! آپ کی جگہ یہ لائبریری نہیں، یونیورسٹی ہے۔ آپ وہاں جائیں"۔ بعد میں مجھے اس فقرے کی معنویت کی گہرائی کا احساس ہوا۔ تحدیثِ نعمت کے طور پر بیان کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے ۲۳۔ جولائی ۱۹۶۳ء کو لائبریری اسسٹنٹ (موجودہ لائبریرین) کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ بالآخر ۱۹۹۵ء میں چیف لائبریرین کے عہدے تک پہنچا۔ پھر ۹۔ اکتوبر ۲۰۰۱ء کو اسی عہدے سے ریٹائر ہوا۔ فالحمد للہ علیٰ احسانہ۔

غلام رسول شاہ صاحب پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں اسسٹنٹ لائبریرین (موجودہ سینئر لائبریرین) تھے۔ رحیم صاحب کے بعد وہی لائبریری کے امور کے نگران تھے۔ شعبۂ لائبریری سائنس میں جزوقتی لیکچرر کی حیثیت سے ہمیں پڑھاتے تھے۔ ان کا پیپر فہرست سازی (Cataloguing) تھا۔ بہت محنت کے ساتھ تدریسی کام کرتے تھے۔ نصابی کتاب: اے۔ ایل۔ اے کیٹیلاگنگ رولز کلاس روم میں ساتھ لاتے تھے۔ فہرست سازی کے حوالے سے ہوم ورک/ اسائنمنٹ (Assignment) بھی دیتے تھے۔ پھر طلبہ/ طالبات کے بنائے ہوئے کارڈز کو چیک بھی کرتے تھے۔ اپنے حالات کی وجہ سے کچھ پریشان بھی رہتے تھے۔ ایک بار بہت عجیب واقعہ رونما ہوا۔ میں نے کارڈز بنائے تھے۔ وہ ان کو فارغ اوقات میں چیک کرتے تھے۔ جب انہوں نے کارڈز واپس کیے، تو میرے ایک کارڈ پر لیڈ پنسل (Led pencil) کے ساتھ لکھا ہوا تھا: "Better to leave the class" میں اس کو پڑھ کر بہت پریشان ہوا۔ اسی پریشانی میں ان کے دفتر میں گیا۔ اکیلے بیٹھے ہوئے کام میں مصروف تھے۔ میں نے وہ کارڈ ان کے سامنے رکھتے ہوئے کہا کہ آپ نے میرے کارڈ پر کیا لکھ دیا ہے۔ استاد کا کام تو سمجھانا ہوتا ہے نہ کہ طالب علم کی حوصلہ شکنی کرنا۔ میری یہ بات سن کر مرحوم نے اس فقرے کو مٹانا شروع کر دیا اور کہنے لگے: کوئی بات نہیں۔ یہ ان کی عظمت کی نشانی تھی۔ پھر شفقت کے ساتھ پیش آتے رہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے سایۂ رحمت میں رکھے اور ان کے درجات بلند کرے۔

مس شٹ امریکہ کی کسی ریاست سے فل برائٹ پروفیسر کی حیثیت سے یونیورسٹی میں آئی تھیں۔ انہوں نے شروع میں ہمیں تین کورسز پڑھانے شروع کیے۔

۱۔ انتظامیات (Administation)

۲۔ حوالہ جاتی خدمات (Reference Services)

۳۔ کتابیات و انتخابِ کتب (Bibliography & Book Selection)

جب رحیم صاحب کینیڈا سے واپس آ گئے تو انتظامیات کا پیپر وہ پڑھانے لگے۔ مس شٹ کا لہجہ (Accent) بہت مشکل سے سمجھ میں آنے والا تھا۔ اگر کبھی کلاس روم میں آخری سیٹوں پر بیٹھنے کا اتفاق ہو جاتا تو بہت مشکل سے ان کی بات سمجھ میں آتی تھی۔ اگر مردانہ

سیٹوں کے شروع میں بیٹھ جاتے تو بہت توجہ کے ساتھ سننے سے ان کی بات سمجھ میں آتی تھی۔ کلاس روم میں پہلی سیٹیں لیڈیز کے لیے مختص ہوتی تھیں۔ اس مشکل صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے کم سے کم ایک ماہ تک Reference کا صحیح مفہوم سمجھ میں نہ آیا۔ جب حوالہ جاتی خدمات کی اصطلاح سامنے آئی تو ساری مشکل حل ہو گئی۔

مس شٹ کا طریق تدریس بہت مختلف تھا۔ وہ خود بہت محنت کرتی تھیں اور طلبا/ طالبات سے بھی یہی توقع رکھتی تھیں۔ ان کو ہم تدریسی اوقات کے بعد سارا وقت لائبریری میں معروف دیکھتے۔ وہ تفویض کار (Assignment) اور ریڈنگ لسٹ کو خود ٹائپ کرتیں، پھر سٹینسل کی وساطت سے کاپیاں سائیکلوسٹائل کے ذریعے نکالتی تھیں۔ صبح کلاس روم میں ان کو طلبا/ طالبات میں تقسیم کر دیتی تھیں۔ اس وقت تک یہاں فوٹو کاپی کا استعمال شروع نہیں ہوا تھا۔ وہ ہمیں اتنا کام دے دیتی تھیں کہ ہم تدریسی اوقات کے بعد سارا وقت لائبریری میں گزار دیتے تھے گویا لائبریری ہماری لیبارٹری تھی۔ ہم کہتے تھے کہ لائبریری ہمارا اوڑھنا بچھونا ہے۔ اس طرح محنت کے ساتھ ہم سے کام کروایا جاتا تھا کہ بعض اوقات تو لائبریری کے بند ہونے تک ہمیں کام کرنا پڑتا تھا۔ نوٹس (Notes) تیار کرنے کے لیے بھی یہی صورتِ حال ہوتی تھی۔ بنک سکیئر میں امریکن سنٹر کی لائبریری تھی۔ وہاں سے امریکی نصابی کتاب پڑھنے کے لیے آسانی سے مل جاتی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ انتظامیات کے نوٹس میں نے وہاں بیٹھ کر تیار کیے تھے۔ جب وہاں لائبریری بند کرنے کا سگنل ہوتا، تب میں وہاں سے اٹھتا تھا۔ نوٹس تیار کرنے سے پیپر کی آدھی سے زیادہ تیاری ہو جاتی تھی۔ عصر حاضر کے دور کی سہولتیں میسر نہیں تھیں۔

ع بہین تفاوتِ راہ از کجا ست تا بکجا

ڈپلوما کی کلاس میں پڑھتے ہوئے ایک اور اہم بات مشاہدہ میں آئی کہ کبھی کبھار بیرونی ماہرین سے لیکچر بھی دلوایا جاتا تھا۔ ہماری کلاس میں ایک بار نصیر احمد ناصر صاحب نے لیکچر دیا تھا۔ اس وقت وہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے شعبے میں کام کرتے تھے۔ اسی طرح ایک امریکی خاتون لائبریرین نے ہمیں لیکچر دیا تھا جس میں انھوں نے پاکستان میں لائبریرین شپ کے شعبے میں موجود مسائل کی نشاندہی کی تھی۔ یہ بات انھوں نے خاص طور پر کہی تھی کہ یہاں بڑی تحقیقی لائبریریوں میں مقامی اخبارات کی مکمل فائلیں محفوظ نہیں ہیں۔ وہ یہ بتانا چاہتی تھیں کہ چونکہ آپ مستقبل کے لائبریرین ہیں، اس لیے آپ کو آئندہ ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا ہوگا۔ پرنٹنگ کی تاریخ بھی ہمارے نصاب کا حصہ تھی۔ یہ بہت تکنیکی نوعیت کا کام تھا۔ اس وقت اولڈ کیمپس میں یونیورسٹی پریس کی عمارت لائبریری کے بالکل سامنے تھی۔ ایک بار پوری کلاس کو یونیورسٹی پریس لے جایا گیا۔ اس وقت پریس سپرنٹنڈنٹ مولوی ظفر اقبال صاحب تھے۔ انہوں نے تھوڑی دیر کے لیے ہمارے لیے پریس کے متعلق تعارفی کلمات کہے۔ ہم نے ان کو پہلی بار یونیورسٹی میں دیکھا تھا۔ تعارفی کلمات کے بعد پریس میں ہونے والے عملی کام کا مشاہدہ بھی کروایا گیا۔ بعد میں نصاب تبدیل ہو گیا اور کورس سے یہ حصہ نکال دیا گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ نصاب میں بھی تبدیلی آتی رہتی ہے اور یہ عمل ضروری بھی ہے۔ اس طرح زندگی میں بھی تبدیلی کا عمل جاری رہتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے کہا تھا:۔

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں!

ایم۔اے کا سیشن (۱۹۷۴ء۔۱۹۷۵ء)

پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ لائبریری سائنس میں ایم۔اے کی کلاس ۱۹۷۴ء میں شروع ہوئی۔ یہ کلاس پنجاب میں بہت تاخیر سے شروع ہوئی۔ کراچی یونیورسٹی میں بہت سال پہلے ۱۹۶۲ء میں شروع ہو چکی تھی۔ اس وجہ سے شعبہ پر لائبریرینز کی طرف سے سخت دباؤ تھا۔ اس وقت رحیم صاحب شعبہ کے صدر بھی تھے۔ ظاہر ہے کہ ان پر بھی بہت دباؤ تھا۔ ڈاکٹر ممتاز انور صاحب ۱۹۷۳ء میں امریکہ سے واپس

آگئے تھے۔وہ پٹسبرگ سے پی ایچ۔ڈی کی ڈگری لے کر آئے تھے۔ان کے آنے سے اس سلسلے میں تیاری شروع کر دی گئی۔فیصلہ ہوا کہ ۱۹۷۴ء کے سیشن میں ایم۔اے کی کلاس کو شروع کر دیا جائے گا۔

اس کلاس میں داخلے کے لیے پورے پنجاب کے لائبریرینز کا دباؤ تھا۔۱۹۷۴ء میں شعبہ کو نئی بلڈنگ (نیو کیمپس) میں منتقل کر دیا گیا۔اس عمارت کا آدھا حصہ بزنس ایڈمنسٹریشن کی تحویل میں تھا۔باقی حصہ شعبۂ لائبریری سائنس کو دے دیا گیا۔یہ عمارت باقی تدریسی شعبوں کی عمارات سے الگ تھلگ تھی۔اس میں ایم۔اے کی کلاس کے لیے جو کمرہ مختص کیا گیا،اس میں اٹھائیس کرسیاں رکھی جا سکتی تھی۔ چنانچہ شعبہ کی انتظامیہ نے ایم۔اے کی کلاس کی اٹھائیس سیٹیں رکھیں۔اخبار میں اشتہار کے بعد داخلے کے حتمی درخواست گزاروں کا پہلے تحریری ٹیسٹ (Written Test) ہوا،اس کے بعد انٹرویو ہوا۔اس کے بعد نیو کیمپس کی عمارت میں داخلے کے لیے کامیاب امیدواروں کی فہرست لگا دی گئی۔اسی دوران لائبریرینز کے ایک گروہ کی طرف سے سول کورٹ میں مقدمہ دائر کر دیا گیا کہ داخلہ قواعد وضوابط کے مطابق نہیں ہو رہا۔عدالت نے حکم دیا کہ اس فہرست کو منسوخ کر دیا جائے۔دوبارہ نیشنل پریس میں داخلے کا اشتہار دیا جائے۔دوبارہ تحریری ٹیسٹ اور انٹرویو لیا جائے۔اس کے بعد کامیاب امیدواروں کی فہرست کا اعلان کیا جائے۔چنانچہ اس عدالتی حکم پر عمل کرتے ہوئے یہ سارا عمل پھر دہرایا گیا اور کامیاب امیدواروں کی فہرست نوٹس بورڈ پر آویزاں کر دی گئی۔

انہی دنوں میں نے ایک دلچسپ مکالمہ سنا جو ڈاکٹر ممتاز انور صاحب اور ملک خورشید صاحب (لائبریرین، گورنمنٹ کالج، ساہیوال) کے درمیان ہوا۔اس وقت وہاں الطاف شوکت صاحب بھی موجود تھے۔اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ایک روز میں کسی کام کے سلسلے میں لائبریری میں غلام رسول شاہ صاحب کے کیبن میں داخل ہوا۔ان دنوں شاہ صاحب غالباً بیماری کی وجہ سے رخصت پر تھے۔ میں نے دیکھا کہ اس کیبن میں ڈاکٹر ممتاز صاحب بیٹھے ہیں اور ان کے ساتھ دونوں مذکورہ بالا حضرات بیٹھے ہیں۔ملک خورشید صاحب ڈاکٹر صاحب سے کہہ رہے تھے کہ آپ اٹھائیس کی تعداد میں داخلہ کیوں کر رہے ہیں، سیٹوں کی تعداد زیادہ کر دیں۔ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ جس کمرے میں اس کلاس کی تدریس ہو گی اس میں صرف اٹھائیس کرسیاں ہی آتی ہیں۔زیادہ تعداد میں داخلہ نہیں کیا جا سکتا۔ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ آپ خود جا کر اس کمرے کو ملاحظہ کریں۔ملک خورشید صاحب کہہ رہے تھے کہ آپ طلبہ/ طالبات کو زمین پر بٹھائیں اور اس طرح داخلے میں سیٹوں کی تعداد زیادہ کریں۔ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ میں لائبریرینز کو زمین پر نہیں بٹھاؤں گا۔شاید ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ یہ ان (لائبریرینز) کے وقار اور عزت کا مسئلہ ہے۔چنانچہ وہی ہوا، جو ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے یعنی اٹھائیس امیدواروں کا داخلہ کیا گیا۔

پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے راقم السطور (سید جمیل احمد رضوی) اور نصیر احمد صاحب (سابق چیف لائبریرین) کا داخلہ ہوا۔ایم پی اے کے شعبہ سے مس امۃ الزہرا زیدی کا ایڈمشن (Admission) ہوا۔یونیورسٹی کی ایک اور خاتون لائبریرین مس نگہت اعزاء کا داخلہ ہوا۔یہ شادی کے بعد مسز سکھیرا کے نام سے پکاری جانے لگیں۔پہلے سال میں ایم۔اے کی کلاس میں یونیورسٹی سے یہ چار امیدواروں کا داخلہ ہوا۔دیگر چند امیدواروں کے نام یہ ہیں: عبدالستار (بعد میں ڈاکٹر عبدالستار)، سجاد الرحمٰن (بعد میں ڈاکٹر سجاد الرحمٰن)، محمد شفیع صدیق (لائبریرین، گورنمنٹ کالج، جڑانوالہ، ضلع فیصل آباد)، محمد شفیع مغل، صفدر علی گوریجہ، جنوبی پنجاب سے نور محمد خاں بلوچ، محبوب احمد لغاری اور دوست محمد کھوسہ داخل ہوئے۔ان کے علاوہ پرویز سلیم (لائبریرین، کے۔ای میڈیکل کالج، لاہور) غلام حسین ممتاز، ملازم حسین شباب، سنٹرل لائبریری بہاول پور کے چوہدری محمد اشرف جلال، محمد اشرف صاحب (لاہور میں کسی کالج کی لائبریری میں لائبریرین تھے)۔ہیرلڈ جوناتھن (جو پشاور سے آئے تھے) اور سائیں محمد ملک (یہ بھی پشاور سے آئے تھے)، منظر حسین شاہ (جو گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں لائبریرین تھے)۔داخل ہونے والوں میں محمد تقی جالب بھی شامل تھے، جو غالباً پیر محل (ضلع فیصل آباد) سے آئے تھے۔چند خواتین بھی اس فہرست میں

شامل تھیں۔اس طرح عموماً وہ لائبریرئینز اس کلاس میں شامل تھے جو اپنے اپنے دور میں یونیورسٹی کی ڈپلوما کلاس میں فسٹ یا سیکنڈ آئے تھے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایم۔اے کی پہلی کلاس میں داخل ہونے والے لائبریرئینز پنجاب کی کریم (Cream) تھی۔

اس کلاس کے اساتذہ میں اے۔رحیم صاحب، ڈاکٹر ممتاز علی انور صاحب، ملک بشیر علی خاں صاحب اور ملک مشتاق احمد صاحب شامل تھے۔ڈاکٹر ممتاز انور صاحب شعبہ کے چیئرمین تھے۔ملک بشیر علی خاں صاحب شعبہ میں کل وقتی استاد تھے۔رحیم صاحب اور مشتاق احمد صاحب جز وقتی اساتذہ میں شامل تھے۔

رحیم صاحب ہمیں جامعاتی کتب خانہ کا انتظام (Administration of University Library) کا کورس پڑھاتے تھے۔اس حوالے سے ان کا بہت طویل تجربہ بھی تھا۔وہ ۱۹۵۵ء سے پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے لیے لائبریرین (موجودہ چیف لائبریرین) تھے۔قریباً اسی سال سے شعبہ کی صدارت بھی ان کے پاس تھی۔ان کو تدریس کا بھی بہت لمبے عرصے کا تجربہ تھا۔یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ان کی تدریس کا یہ آخری سال تھا۔اس کے بعد انہوں نے شعبہ میں تدریس کا کام نہیں کیا۔اپنی مصروفیات، صحت اور عالم پیری کے آغاز کی وجہ سے انہوں نے پڑھانے کا کام چھوڑ دیا تھا۔وقت کے ساتھ ساتھ انسان کی ترجیحات بدل جاتی ہیں۔اس میں صحت کا بھی بہت دخل ہوتا ہے:

وقتِ پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

میں نے رحیم صاحب سے ڈپلوما کلاس میں بھی پڑھا تھا۔اب ایم۔اے کی کلاس میں بھی ان سے پڑھنے کا خوشگوار تجربہ ہوا۔ان کی انگریزی زبان دانی اور دیگر زبانوں کے ادب سے تعلق خاطر کا پہلے بیان ہو چکا ہے۔جب وہ ڈپلوما کلاس میں تدریس کے لیے آتے تھے، تو روسٹرم کے ساتھ کھڑے ہو جاتے تھے اور لیکچر شروع کر دیتے تھے۔سارا وقت کھڑے کھڑے لیکچر دیتے تھے۔جب انہوں نے ایم۔اے کی کلاس کو پڑھانا شروع کیا تو کلاس روم میں آتے ہی کرسی پر بیٹھ جاتے تھے اور لیکچر کے دوران کرسی پر بیٹھے رہتے تھے۔لیکچر انگریزی میں ہوتا تھا۔ان کے لیکچر میں کلاس کی دلچسپی قائم رہتی تھی۔

رحیم صاحب کلاس میں سوالات بھی کرتے تھے اور تلامذہ سے ان کے جوابات بھی چاہتے تھے۔ایک روز بہت دلچسپ صورتِ حال پیدا ہوئی۔وہ ریسرچ کیرل/ ریسرچ کیبن کے بارے میں بتا رہے تھے۔یہ بھی واضح کر رہے تھے کہ اس کو کس طرح لائبریری میں بنایا جاتا ہے اور ریسرچ کرنے والے کی نگرانی کس طرح کی جاتی ہے۔اس سلسلے میں انہوں نے بتایا کہ ریسرچ کیبن کے دروازے میں تھوڑی سی جگہ پر شیشہ لگا دیا جاتا ہے تا کہ لائبریری کا عملہ گاہے گاہے ریسرچ سکالرز کی نگرانی خاموشی کے ساتھ کر سکے۔اس کا ایک نقصان یہ بتایا کہ اس سے Peeping Tom غلط فائدہ اٹھا سکتا ہے۔یہ اصطلاح خالصتاً امریکی سوسائٹی کے حوالے سے تھی۔رحیم صاحب نے کلاس سے پوچھا کہ Peeping Tom کیا ہوتا ہے۔ہر کوئی اپنی دانست کے مطابق جواب دے رہا تھا، لیکن غلط۔ایک لیڈی سٹوڈنٹ نے کچھ بات کی تو رحیم صاحب مسکرا کر کہنے لگے کہ آپ تو یہ بالکل نہیں ہو سکتیں۔آخر جب یہ عقدہ حل نہ ہوا، تو رحیم صاحب نے بتایا کہ تاک جھانک کرنے والے کو Peeping Tom کہتے ہیں۔اس سے کلاس روم میں قہقہہ بلند ہوا اور سب اس وضاحت سے لطف اندوز ہوئے۔

رحیم صاحب کی کلاس میں ایک اور بات بطور خاص دیکھی گئی کہ وہ گروہی مباحثہ (Group discussion) کی اجازت بھی دیتے تھے۔اگر کوئی ایسا نکتہ ہوتا جس میں طلبا اظہار خیال کرنا چاہتے تو وہ خوش دلی سے ان کے خیالات کو سنتے تھے۔بعض اوقات یہ بحث و تمحیص آدھ آدھ گھنٹے تک طوالت اختیار کر لیتی تھی۔اس سے طلبہ میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا ہوتا تھا اور ایک دوسرے کے خیالات سے آگاہی ہوتی تھی۔جب اس کلاس کا سیشن ختم ہونے کو تھا تو ایک روز رحیم صاحب نے کلاس سے کہا کہ کل آپ کا زبانی ٹیسٹ ہوگا۔یہ ٹیسٹ انگریزی

میں ہوگا۔ جب وہ اگلی کلاس میں آئے تو انہوں نے ''جامعاتی لائبریری'' کی اہمیت کے بارے میں سوال کیا اور کہا کہ اس کا جواب انگریزی زبان میں دیں۔ چند طلبہ نے اس کا جواب دیا۔ ان میں راقم السطور بھی شامل تھا۔ طلبہ کا انگریزی میں جواب سن کر رحیم صاحب کے چہرے پر طمانیت کے آثار ظاہر ہوئے اور کہا کہ مجھے امید ہے کہ اسی کلاس میں سے ہمارے پروفیشن کے لیڈرز (Leaders) ظاہر ہوں گے۔ ان کا فرمانا بجا تھا۔ ایم۔اے کی اسی پہلی کلاس میں دو نے پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی یعنی ڈاکٹر عبدالستار اور ڈاکٹر سجاد الرحمٰن۔ دیگر طالب علموں میں سے بھی متعدد نے اس پروفیشن میں اعلیٰ مناصب پر کام کیا۔ بعض نے علمی دنیا میں بھی اپنا نام پیدا کیا۔ استاد کے لیے یہ امر بہت اطمینان کا باعث ہوتا ہے کہ اس کے شاگرد اپنے اپنے شعبہ میں نام پیدا کریں اور معاشرے میں قابلِ ذکر خدمات سرانجام دیں۔

ڈاکٹر ممتاز انور صاحب ہمیں دو کورسز پڑھاتے تھے۔ اصولِ تحقیق (Research Methodology) اور سائنسی انتظامیات (Scientific Management)۔ رسمی تدریس سے چند روز پہلے وہ غیر رسمی انداز میں بہت عمدہ نکات کی جانب راہنمائی کرنے لگے۔ ایک نکتہ یہ بیان کیا کہ مجھے آپ نے سر (Sir) نہیں کہنا۔ میرا نام لیں یا کسی اور انداز سے خطاب کریں لیکن اس لفظ سے خطاب نہ کریں۔ ایک روز چند طالب علم آپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ Higher education is two way communication۔ یعنی اعلیٰ تعلیم دو طرفہ ابلاغ کا نام ہے۔ جہاں طلبہ استاد سے سیکھتے ہیں وہاں استاد بھی ان سے سیکھتا ہے۔ ایک روز یہ بات کہی کہ تعلیم حاصل کرنا صرف نئی باتیں سیکھنے کا نام نہیں بلکہ بعض باتیں بھلانے کا نام بھی ہے۔ اس کی مثال اس طرح دی کہ کتابیاتی عناصر (Bibliographical elements) میں مقام اشاعت کے بعد کولن (:) استعمال ہوتا ہے، کاما (،) نہیں۔ جو کاما دینے کے عادی ہیں، وہ اس کو بھول جائیں اور کولن یاد رکھیں۔ اسی طرح فہرست سازی (Cataloguing) میں بھی مقام اشاعت کے بعد کولن استعمال کیا جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ پرانے غیر مروج نکات کو بھول جانا چاہیے۔

ایم۔اے کی کلاس کی تدریس کو ابھی دو تین دن ہی ہوئے تھے۔ ہمارے ایک کلاس فیلو محمد شفیع صاحب ڈاکٹر صاحب کے لیکچر کے شروع میں کھڑے ہوئے اور کہنے لگے: ''ڈاکٹر صاحب! آپ ہمیں اردو میں پڑھاتے ہیں جب کہ نصاب کی سب کتابیں انگریزی زبان میں ہیں، امتحان بھی انگریزی میں دینا ہوگا، بہتر ہے کہ آپ ہمیں انگریزی میں پڑھائیں''۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے کہا: ''میں اردو میں پڑھاتا ہوں، اسی زبان میں پڑھاؤں گا بلکہ بوقت ضرورت پنجابی میں بھی پڑھاؤں گا۔ آپ یہ سمجھیں کہ مجھے انگریزی نہیں آتی اگرچہ میں امریکہ میں پڑھا کر آیا ہوں۔ کتابیں واقعی انگریزی زبان میں ہیں۔ یونیورسٹی کی طرف سے اجازت ہے کہ آپ پیپر خواہ انگریزی میں دیں یا اردو میں، اردو میں پیپر حل کرنے کی کوئی ممانعت نہیں ہے''۔ اس جواب کی معنویت میں بہت گہرائی پائی جاتی ہے۔ بنیادی طور پر اصل فکر اور سوچ کا تعلق قومی زبان یا علاقائی زبان کے ساتھ ہے۔ غیر ملکی زبان اس کے ہمسر نہیں ہو سکتی۔ اگر ہم اپنی قومی زبان کے ساتھ سوچیں گے اور لکھیں گے تو ہمارے علمی اور تحقیقی نتائج بہتر ہو سکتے ہیں، بنسبت غیر ملکی زبان کا سہارا لینے کے۔ میں نے اپنی کتاب ''لائبریری سائنس اور اصولِ تحقیق'' کے ''پیش لفظ'' میں اسی حقیقت کی جانب اشارہ کیا تھا۔ اس کا اقتباس ذیل میں دیا جاتا ہے:۔

> یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جامعہ پنجاب میں ۱۹۷۴ء میں ایم۔اے میں چند دوسرے کورسوں کی طرح اصولِ تحقیق کی تدریس بھی قومی زبان ''اردو'' میں شروع کی گئی..... یہ اس وقت کے اساتذہ بالخصوص ڈاکٹر ممتاز علی انور اور ملک بشیر علی خان کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ (۴)

ڈاکٹر ممتاز صاحب نے اس کلاس کو ''انتظامیات'' (Management) کا کورس بھی پڑھایا۔ اس کے ابتدائی لیکچرز میں انہوں نے بتایا کہ اب تک اس شعبہ میں ''انتظامیات'' کے عنوان سے جو کچھ پڑھایا جاتا رہا ہے، وہ دراصل اس کورس کی روح کے مطابق نہیں

ہےاور نہ ہی اس کورس کے بنیادی عناصر کا احاطہ کرتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ابتدائی چند لیکچرز اس کورس کے بنیادی تصورات کے بارے میں دیے اور کلاس کو ذہنی طور پر تیار کیا کہ وہ لائبریری کے معمولات کو سائنسی طریق انتظامیات (Scientific Management of library operations) کے مطابق سمجھنے کے قائل ہو جائیں۔ یہ اس شعبۂ علم (Discipline) کے نئے تصورات تھے جن کے ساتھ کلاس کو متعارف کروایا گیا۔ یہ نئے علم کی نئی روشنی تھی جو جامعہ پنجاب کے شعبۂ لائبریری سائنس میں پھیلائی گئی۔ اس میں شک نہیں کہ علم کی مثال روشنی سے دی جاتی ہے۔ عربی میں کہا جاتا ہے: "العلم کالنور" (علم روشنی کی مانند ہوتا ہے)۔

اس کلاس کا یہ پہلو بھی توجہ طلب ہے کہ اس کے زیادہ طلبہ عمر میں کافی سینئر تھے اور ان کا لائبریریوں میں کام کرنے کا طویل تجربہ تھا۔ چند طلبہ ایسے تھے جو اکثریت کے مقابلے میں کم عمر تھے۔ ان میں سجاد الرحمٰن، عبدالستار، غلام حسین ممتاز، پرویز اسلم اور ایک یا دو اور بھی تھے۔ ایک روز ڈاکٹر صاحب کلاس روم کے کے باہر طلبہ کے ساتھ کھڑے تھے۔ لیکچر کا وقت ہونے والا تھا۔ اسی دوران مقابلتاً کم عمر طلبہ با جماعت وہاں آ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے از راہِ تفنّنِ طبع ان سے مخاطب ہو کر کہا: "بچہ پارٹی کتھوں آئی اے" (بچہ پارٹی کہاں سے آئی ہے)۔ اس ٹھیٹھ پنجابی فقرے کو سن کر سب حاضرین بہت محظوظ ہوئے۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی شگفتہ بیانی تھی۔

کلاس میں ایک مرحلہ ایسا آیا کہ ڈاکٹر صاحب نے ریسرچ رپورٹ لکھنے کی بات کی اور چند عنوانات کلاس میں بتائے۔ ایک دو روز اس موضوع پر بات ہوتی رہی۔ ایک عنوان تھا: "اسلام کی درجہ بندی (Classification) کا تقابلی جائزہ"۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ میں اس موضوع پر ریسرچ رپورٹ لکھنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ پہلے اس کے عنوان کو حتمی شکل دیں۔ درجہ بندی (Classification) کا اردو ترجمہ ڈھونڈیں۔ میں نے لائبریری میں حوالے کی کتابوں کو دیکھنا شروع کیا۔ مختلف لغاتوں اور معاجم اصطلاحات کی ورق گردانی کرتا رہا۔ ڈاکٹر صاحب کو اردو ترجمہ/ اصطلاح پسند نہیں آ رہی تھی۔ آخر ان کو "جماعت بندی" کی اصطلاح پسند آئی۔ اب ریسرچ رپورٹ کا یہ عنوان قرار پایا: "اسلام کی جماعت بندی (Classification) کا تقابلی جائزہ"۔ اسی دوران یہ بھی پروگرام بنایا گیا کہ ہر طالب علم/ طالبہ ریسرچ رپورٹ کے خاکے کی تفصیل کو کلاس میں پیش کرے اور اس پر کلاس کی سطح پر بحث کی جائے۔ چنانچہ میں نے بھی اپنی رپورٹ کے خاکے کی تفصیل کو کلاس میں سیمینار کی صورت میں پیش کیا اور اس پر بحث ہوئی۔ اس پیشکش (Presentation) سے طلبہ/ طالبات میں خود اعتمادی پیدا ہوتی تھی اور اپنے تحقیقی موضوع کا دفاع کرنے (Defend) کی صلاحیت ابھر کر سامنے آتی تھی۔ یہ رپورٹ اگرچہ پچیس نمبر کی تھی، لیکن اس کی تیاری اسی طرح کی گئی جیسے مکمل مقالہ (Thesis) لکھا جاتا ہے۔

میری ریسرچ رپورٹ سے متعلقہ چند کتب ایسی تھیں جو ہماری لائبریری میں نہیں تھیں۔ کراچی یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود تھیں۔ ہم نے لائبریری کی سطح پر کوشش کی کہ یہ کتابیں ہمیں چند ہفتوں کے لیے مستعار مل جائیں یعنی Inter library loan پر، لیکن اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ میں یہ بات ڈاکٹر صاحب کے علم میں لایا۔ انہوں نے کراچی میں رابطہ کیا۔ اس کے نتیجے میں وہ کتابیں ہمیں مستعار وصول ہو گئیں۔ ان سے استفادہ کیا گیا اور پھر ان کو واپس کراچی یونیورسٹی بھیج دیا گیا۔

اس زمانے میں ڈاکٹر صاحب کے پاس اچھا خاصا ذاتی ذخیرۂ کتب تھا۔ وہ قابلِ اعتماد طلبہ کو اپنی ذاتی کتابیں پڑھنے کے لیے دے دیتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ڈاکٹر انیس خورشید مرحوم کی کتاب (Cataloguing of Pakistani Names) کا اصل انگریزی ایڈیشن دستیاب نہیں ہو رہا تھا۔ اس کا اردو ترجمہ "پاکستانی ناموں کی کیٹلاگ سازی" لائبریری میں موجود تھا۔ ایک روز میں نے ڈاکٹر صاحب سے اس بارے میں استفسار کیا تو آپ نے کہا کہ یہ میرے پاس موجود ہے۔ چنانچہ انہوں نے یہ ذاتی کتاب مجھے پڑھنے کے لیے دی۔ میں نے اس کو چند روز میں پڑھ لیا۔ پھر ڈاکٹر صاحب کو واپس کر دی۔ شاید ایک اور کتاب بھی میں نے ڈاکٹر صاحب سے مستعار لی تھی۔ اس طرح ایم اے کی پہلی کلاس میں استاد اور شاگرد کے درمیان ایسی اعتبار کی فضا قائم ہو گئی جس سے علم کے متلاشی طلبہ نے بہت فائدہ اٹھایا۔

ایک اور بات قابلِ ذکر ہے کہ ڈاکٹر صاحب جب کلاس روم میں لیکچر دیتے تھے تو مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ دوران لیکچر شاید ایک لفظ بھی زائد نہیں بولتے۔ اتنے ہی الفاظ استعمال کرتے جتنے ضروری ہوتے تھے۔ پھر یہ بھی تھا کہ وہ زیرِ حوالہ موضوع کے متعلق کوئی اہم نکتہ چھوڑتے نہیں تھے۔ یہ اختصارِ کلام اس وقت تھا جب وہ جوانی کے دور سے گزر رہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ اب (۲۰۱۵ء) ان کے کلام میں اور بھی اختصار آ گیا ہے۔ زیرِ حوالہ شعبہ کی انتظامیہ نے ۱۸۔ جون ۲۰۱۵ء کو بوقت ۱۱ بج کر ۱۵ منٹ قبل دوپہر چند سینئر اساتذہ اور لائبریرین کو بلایا تا کہ ان کو نومبر ۲۰۱۵ء میں منعقد ہونے والی بین الاقوامی کانفرنس کے لیے اعزازی رجسٹریشن دی جائے۔ اس میں راقم کا نام بھی شامل تھا۔ میں وقت پر شعبے میں پہنچ گیا۔ ڈاکٹر صاحب، ملک بشیر علی خان صاحب اور دیگر سینئر حضرات سے ملاقات ہوئی۔ اس تقریب کے اختتام پر ان مدعو حضرات کے تاثرات ریکارڈ کیے جا رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے سب سے آخر میں اپنے تاثرات چند انتہائی مختصر جملوں میں اور بہت دھیمی آواز میں ریکارڈ کروائے۔ میں اس وقت موجود تھا۔ میں ڈاکٹر صاحب کے قریب گیا اور کہا کہ ڈاکٹر صاحب! عربی میں ایک مقولہ ہے: خیر الکلام ما قل و دل (یعنی بہترین کلام وہ ہوتا ہے جو مختصر اور بادلیل ہو)۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے کہا حضور ﷺ نے جو خطوط بادشاہوں کو لکھے تھے وہ چند سطری ہی تھے۔ میرے سامنے نبی کریم کا یہ اسوۂ حسنہ ہے۔ یہ کتنی خوبصورت توجیہہ ہے۔

ایک اور واقعہ دسمبر ۱۹۷۴ء میں ڈاکٹر صاحب کے لیکچر کے دوران رونما ہوا۔ ڈاکٹر صاحب پڑھا رہے تھے کہ کلاس روم کے دروازے پر دستک ہوئی اور ایک صاحب اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے ایک چٹ ڈاکٹر صاحب کو دی۔ انہوں نے اس کو پڑھا اور یہ کہہ کر لیکچر ختم کر دیا: "شاہ صاحب (غلام رسول شاہ صاحب) کا انتقال ہو گیا ہے" اور کمرے سے باہر چلے گئے۔ تمام طلبہ/ طالبات بھی کلاس روم سے باہر نکل آئے۔ شاہ صاحب پی ایل اے کے جنرل سیکرٹری رہے تھے۔ ۱۹۷۴ء میں ڈاکٹر صاحب پی ایل اے کے جنرل سیکرٹری تھے۔ اپنے کمرے میں چلے گئے اور اس افسوسناک خبر کی اطلاع رسانی کا کام شروع کر دیا۔ غلام رسول شاہ صاحب کا انتقال ۶۔ دسمبر ۱۹۷۴ء کو ہوا تھا۔ وہ میو ہسپتال میں داخل تھے۔

ملک بشیر علی خان صاحب آسٹریلیا سے پڑھ کر آئے تھے۔ عام گفتگو سرگودھا کے لہجہ میں پنجابی زبان میں کرتے تھے اور اب بھی کرتے ہیں۔ وہ ہمیں لائبریرین شپ اور معاشرہ (Librarianship and Society) کا کورس پڑھاتے تھے۔ جب وہ پہلے روز کلاس روم میں آئے تو انہوں نے روسٹرم کے پیچھے دیوار کی کھڑکی کو تازہ ہوا کے لیے کھولا۔ اس وقت کلاس روم کا گردوپیش ایسا تھا کہ باہر سے شور نہیں آتا تھا۔ کلاس کے طلبہ نے آہستہ سے اس تاثر کا اظہار کیا کہ یہ نوجوان کا عمل ہے۔ پہلے یہ کھڑکی ہماری کلاس میں کسی استاد نے نہیں کھولی تھی۔

جب ہمارا داخلہ ایم۔ اے کی کلاس میں ہو گیا۔ ابھی تدریس میں چند روز باقی تھے۔ میں ایک روز شعبہ میں آیا اور ملک صاحب سے ملاقات کی۔ کورس سے متعلق کچھ پڑھنے کے متعلق استفسار کیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ملک صاحب نے ڈاکٹر جے۔ ایچ۔ شیرا کی کتاب Sociological Foundations of Librarianship پڑھنے کے لیے کہا۔ میں نے یہ کتاب لائبریری سے اشو کروائی اور اسے خوب اچھی طرح پڑھا۔ اس کا موضوع لائبریری اور سوسائٹی ہے۔ یہ کتاب مجھے اتنی پسند آئی کہ میں نے اس کا اردو ترجمہ کیا۔ اس کو پی ایل اے (پنجاب برانچ) نے ۱۹۸۰ء میں پہلی بار شائع کیا۔ اس کتاب کو ڈپلوما کورس کے نصاب میں شامل کر لیا گیا۔ اس کا دوسرا نظر ثانی شدہ ایڈیشن مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد نے ۱۹۸۷ء میں شائع کیا۔ ملک بشیر علی خان صاحب نے اس کا پیش لفظ لکھا تھا۔ اس وقت ملک صاحب شعبہ کے صدر/ چیئرمین تھے۔ ان کی یہ تحریر دونوں طباعتوں میں شامل ہے۔ اس کا ایک اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

> موجودہ کتاب پروفیسر شیرا کے ان لیکچرز کے ترجمے پر مشتمل ہے جو انہوں نے ۱۹۶۷ء میں رنگا ناتھن لیکچرز کے سلسلے میں ہندوستان میں ٹیپ پر منتقل کر کے دیے اور جو بعد میں کتابی شکل میں شائع کر دیے گئے۔ ان لیکچرز میں

انہوں نے لائبریری کے ساتھ فرد معاشرہ اور علم کے تعلق کا عالمانہ تجزیہ کیا ہے اور بعد میں انسانی معاشرے میں تغیر وتبدل کے سیاق وسباق میں لائبریرین کی تعلیم وتربیت کے خدوخال کی وضاحت کی ہے۔ پروفیسر شیرا کا انداز بیان انتہائی مدلل، جامع اور اختصار پسند ہے۔ اور پڑھنے والے پر ایک انتہائی گہرا تاثر مرتب کرتا ہے۔ ان کے نظریات اس وقت تمام دنیا میں اپنا اثر دکھا رہے ہیں اور خاص طور پر لائبریرین کی تعلیم وتربیت میں جو تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں اُن پر اثر نمایاں طور پر ظاہر ہو رہا ہے۔

سید جمیل احمد رضوی نے اس ترجمہ کو پیش کر کے شیرا کے نظریات کو اردو دان طبقے تک پہنچا دیا ہے۔ اردو زبان میں اس سے قبل اس قسم کی تصنیف کی کمی شدت سے محسوس کی جا رہی تھی۔ یہ ترجمہ نہ صرف لائبریری سائنس کے طلباء کے لیے ہی مفید ہوگا بلکہ یہ ایک ایسی پیشکش ہے جس کا مطالعہ ان تمام اصحاب کے لیے مفید ہوگا جو اس پروفیشن کے مستقبل سے وابستہ ہیں۔ (۵)

یہ کتاب کا واقعہ جملہ معترضہ کے طور پر درمیان میں آ گیا۔ اب پھر ملک صاحب کی تدریس کی جانب لوٹتے ہیں۔ ملک صاحب جب کلاس روم میں لیکچر شروع کرتے تو پہلے زیر حوالہ موضوع کے متعلق کتابوں کی ایک لمبی فہرست بتا دیتے۔ یہ ریڈنگ (Reading) کے لیے ہوتی تھی۔ ہم ان کتابوں کو تلاش کرتے، بعض اوقات مشکل سے دستیاب ہوتی تھیں۔ پھر ان میں متعلقہ میٹریل تلاش کرتے۔ بعض کتابوں میں تو کچھ مل جاتا اور بعض میں کچھ نہیں ملتا تھا۔ ہم حیران ہوتے کہ ملک صاحب نے یہ کتاب کیوں بتائی۔ سیشن کے آخر میں ہمیں پتا چلا کہ ملک صاحب کا مقصد زیادہ سے زیادہ کتابوں سے متعارف کروانا ہوتا تھا۔ اس طرح کا کتابیاتی علم (Bibliographical knowledge) بھی بہت مفید ہوتا ہے۔ کم سے کم زیادہ سے زیادہ کتابوں کو دیکھنے کا موقع مل جاتا ہے۔

ایک اور اہم نکتہ جو ملک صاحب کی تدریس کے متعلق بتانا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ملک صاحب جب کسی موضوع پر لیکچر دینا شروع کرتے تھے تو اس کی صورت اس مثال سے سمجھی جا سکتی ہے کہ پہلے وہ ایک چھوٹا سا دائرہ معلوم ہوتا تھا، پھر پھیلتا جاتا تھا یہاں تک کہ اس کا سائز اتنا وسیع وعریض ہو جاتا تھا کہ اب ڈھونڈنا مشکل ہوتا تھا کہ اصل موضوع کی حدیں کہاں سے شروع ہوتی ہیں اور کہاں پر ختم ہوتی ہیں۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:۔

جنوں کی وسعتوں پہ تنگ ہے سجدہ دو عالم کا
جو سجدہ ہو تو پھر سجدہ بقید آستاں کیوں ہو

اس صورت حال میں اب یہ سننے والوں کا کمال ہوتا تھا کہ وہ اصل موضوع کے بارے میں مفید نکات تلاش کریں اور ان کو اپنے حافظے میں محفوظ رکھیں۔ اس طریق تدریس کی اپنی افادیت ہوتی ہے۔ طلبا/ طالبات کو متوجہ رہنا پڑتا ہے کہ کہاں اہم نکتہ آتا ہے جس کو وہ نوٹ کر لیں۔ ہمارے ساتھ بھی یہی ہوتا تھا۔ اس طریق تدریس سے زیر نظر موضوع کا وسیع تعارف ہو جاتا تھا اور پھر طلبہ کی ذہنی استعداد پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ خود اصل ''گوہر آبدار'' کو تلاش کریں۔

ملک بشیر علی خاں صاحب ہمیں تیسرا پیپر بعنوان: Resources in Humanities, Social Sciences & Science and Technology بھی پڑھاتے تھے جیسا کہ اس کے عنوان سے ظاہر ہے، اس کورس کا دامن وسعت بہت زیادہ تھا۔

تعلیمی سیشن کے دوران ایک مرحلہ ایسا بھی آیا جس میں نظریہ علم، اس کی ماہیت اور حدود (Epistemology) کا مطالعہ زیر بحث آیا یہ بہت دلچسپ اور علمی موضوع تھا۔ اس میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ علم کس طرح پیدا ہوتا ہے، اس کو کس انداز سے مرتب کیا جاتا ہے اور

پھر اس کو استعمال کرنے والے کس طرح اس سے مستفید ہوتے ہیں۔اس میں بہت فلسفیانہ اور دقیق مباحث آتے ہیں۔ملک صاحب کے لیکچرز میں ان باریک نکتوں پر بھی بات ہوتی تھی خواہ اختصار کے ساتھ ہی سہی۔پھر ایک اور علمی مشق سامنے آئی جس کو موضوع کا مطالعہ (Subject Study) کا نام دیا گیا تھا۔ملک صاحب نے ہر طالب علم/ طالبہ کو سبجیکٹ سٹڈی کرنے کا کام بطور تفویض کار (Assignment) دیا۔تیاری کے بعد اس کو کلاس روم میں پیش کرنا تھا تا کہ کلاس کی سطح پر اس پر بحث ہو اور پیش کرنے والا اپنی سٹڈی کا دفاع کرے۔یہ ایک طرح کا سیمینار ہوتا تھا جس میں ساری کلاس حصہ لیتی تھی۔میرے موضوع کا عنوان: ''تاریخ اسلام کے لٹریچر کا تعارف'' تھا۔میں نے اس پر ایک پیپر سیمینار کے لیے تیار کیا اور اس کو کلاس میں پڑھا۔پھر اس پر کلاس کی سطح پر بحث بھی ہوئی۔اسی طرح چند دیگر طلبہ نے بھی اپنے اپنے مفوضہ (Assigned) موضوع کے متعلق تیاری کی اور سیمینار میں حصہ لیا۔اس تفویض کار سے کسی موضوع کے بارے میں بہت گہرائی میں جا کر مطالعہ کرنا پڑتا تھا۔میرا خیال ہے کہ اب اس تحریر کا رنگ بہت فلسفیانہ اور دقیق ہوتا جا رہا ہے۔اس لیے اب اس کو یہاں پر ختم کر دینا ہی بہتر ہے۔

اسی سیشن میں ایک اور قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ بعض طلبہ عوامی کتب خانے کا نظم ونسق (Administration of Public Library) پڑھنا چاہتے تھے۔اساتذہ کی کمی کی وجہ سے یہ کورس آفر (Offer) نہیں کیا گیا تھا۔ڈاکٹر ممتاز انور صاحب اور ملک بشیر علی خان صاحب نے کہا کہ اگر آپ یہ کورس پڑھنا چاہتے ہیں تو گروہی مباحثہ (Group discussion) کے طریق پر پڑھایا جا سکتا ہے۔اس میں شمولیت اختیار کرنے والے ہر طالب علم کے ذمے ایک موضوع لگا دیا جاتا تھا۔وہ اس کی تحریری تیاری کرتے تھے اور اس مخصوص گروپ میں پیش کرتے تھے۔ڈاکٹر ممتاز صاحب اور بشیر صاحب نگران کی حیثیت سے کلاس میں بیٹھتے تھے۔پیپر کو پیش کرنے کے بعد اس پر بحث ہوتی تھی۔اس طرح اس طریقِ تدریس کی ساری ذمہ داری بنیادی طور پر طلبہ پر تھی اور یہ دونوں اساتذہ اس مباحثہ میں موجود ہوتے تھے۔ان کے ذمے لیکچر دینے کی ذمہ داری نہیں تھی۔ایک مباحثے میں راقم السطور بھی ''سامع'' کی حیثیت سے شریک ہوا تھا اور اس پورے عمل کا مشاہدہ کیا تھا۔

ہماری کلاس کا سیشن ختم ہونے کو تھا۔اس وقت نہر عبور کرنے کے لیے پرانے بی موجود تھے۔میں یونیورسٹی بس پر سوار ہونے کے لیے لائبریری سائنس کی موجودہ عمارت کے سامنے والے پرانے بی کی طرف جا رہا تھا۔ملک بشیر علی خاں شعبہ کی عمارت سے باہر نہر کی طرف آ رہے تھے۔جب انہوں نے مجھے دیکھا تو سوال کیا: شاہ صاحب! اس ایک سالہ تعلیم کے دوران آپ نے کیا محسوس کیا؟ ابھی میں نے سوال کا جواب نہیں دیا تھا کہ ملک صاحب نے ایک اور سوال کر دیا: کیا اپنے آپ میں کچھ تبدیلی محسوس کر رہے ہیں؟ میں نے جواب میں کہا کہ ہاں، ایم۔اے کی کلاس میں یہ وقت گزار کر خود میں تبدیلی کا احساس تو ہوتا ہے۔ملک صاحب نے اس پر برجستہ کہا کہ تعلیم کا اصل مقصد بھی یہی ہے کہ متعلم اپنے اندر تبدیلی محسوس کرے۔اب میں (راقم السطور) یہ سمجھتا ہوں کہ اس استاد کو اپنی کامیابی پر فخر کرنا چاہیے جو اپنے شاگردوں میں تدریس کے ذریعے بہتر تبدیلی لائے اور وہ ملک وملت کے لیے بہتر خدمات ادا کرنے کے قابل ہو جائیں۔

مشتاق احمد صاحب جز وقتی لیکچرار کی حیثیت سے کلاس کو پڑھاتے تھے۔ان کے ذمے Advanced Classification and Cataloguing کا کورس تھا۔اس میں درجہ بندی نظاموں کا بھی تقابلی مطالعہ کیا جاتا تھا۔مشتاق صاحب اس زمانے میں لاہور ہائی کورٹ کی لائبریری میں بطور لائبریرین کام کرتے تھے۔مشتاق صاحب نے ایشیا فاؤنڈیشن کے سکالرشپ پر کراچی یونیورسٹی سے ایم۔اے (لائبریری سائنس) کی ڈگری لی تھی۔مشتاق صاحب بہت دھیمے انداز سے انگریزی میں لیکچر دیتے تھے۔موضوع کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتے تھے۔ایسا بھی ہوتا تھا کہ بعض اوقات وہ بہت اہم نکات کو بھی اسی دھیمے انداز میں بیان کر جاتے تھے۔کبھی کبھار یہ بھی بتا دیتے تھے کہ یہ اہم نکتہ ہے جو میں نے بیان کیا ہے۔

میری ریسرچ رپورٹ کے رہنما اور سپروائزر مشتاق صاحب تھے۔ان کی زیرِ نگرانی میں نے یہ ریسرچ رپورٹ تیار کی تھی۔میں گاہے گاہے لاہور ہائی کورٹ کی لائبریری میں اپنا لکھا ہوا کام ان کو دکھانے کے لیے جاتا تھا۔ہم دونوں میں بے تکلفی بھی تھی۔ہم نے یونیورسٹی لائبریری کے اورینٹل سیکشن میں کئی سال اکٹھے کام کیا تھا۔ہمارے ساتھ قاضی عبدالنبی کوکب (م ۱۹۔جنوری ۱۹۷۸ء) بھی اسی سیکشن میں بیٹھ کر مخطوطات کی فہرست سازی کا کام کرتے تھے۔قاضی صاحب معروف عالم دین اور عربی زبان وادب کے ماہر تھے۔ انہوں نے اسلامی موضوعات پر کئی کتابیں لکھیں۔نہایت شریف اور خلیق انسان تھے۔ان کے علم وفضل کا لاہور میں چرچا تھا۔وہ ضلع کچہری کے چوک میں ٹریفک کے ایک حادثے میں شدید زخمی ہوئے اور اسی رات ان کا میو ہسپتال میں انتقال ہوگیا[۲]۔ڈاکٹر خورشید رضوی کا یہ شعر ان کے بارے میں ہے:۔

وہ کوکبِ سحر کہ جو مٹی میں جا ملا
خورشید اب کہاں سے اس کو ڈھونڈ لاؤں میں

ایسی صورتِ حال میں غالب کا یہ شعر بھی یاد آتا ہے:۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنجہائے گراں مایہ کیا کیے

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جب میں نے ۱۹۷۴ء میں ایم۔اے میں داخلہ لیا، تو قاضی صاحب نے اسی سال ڈپلوما کی کلاس میں داخلہ لیا تھا۔وہ اس وقت ایم۔اے (عربی) تھے۔چونکہ وہ اس زمانے میں شعبہ لائبریری سائنس کے طالب علم تھے اور ہمارے ساتھ ہی اولڈ کیمپس سے یونیورسٹی بس میں نیو کیمپس آتے تھے۔اس لیے شعبہ کے طالب علم کی حیثیت سے ان کا ذکر درمیان میں آگیا۔اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے اور ان کو اپنے سایۂ رحمت میں رکھے۔(آمین)

مشتاق صاحب بعد میں شعبۂ لائبریری سائنس میں کل وقتی مستقل استاد کی حیثیت سے آگئے۔

شعبہ میں تدریس (از ۱۹۷۶ تا ۱۹۸۷ء)

ایم۔اے کی پہلی کلاس کے رزلٹ کا اعلان ۲۰۔فروری ۱۹۷۶ء کو کیا گیا۔۲۶۔امیدوار امتحان میں شامل ہوئے۔۲۵ کامیاب ہوئے۔راقم السطور نے ۳۹۶ نمبر لے کر فسٹ ڈویژن میں امتحان پاس کرلیا۔کل نمبر ۶۰۰ تھے۔اس زمانے میں شعبے میں کل وقتی اساتذہ کی کمی تھی۔جز وقتی اساتذہ کی خدمات حاصل کی گئیں۔ان میں میرا نام بھی شامل تھا۔ڈاکٹر ممتاز صاحب نے مجھے پہلے بتا دیا تھا کہ آپ ڈپلوما کی کلاس کو ایک کورس پڑھائیں گے۔ملک بشیر علی خاں By rotation کے ضابطے کے تحت شعبہ کے چیئرمین تھے۔میرا باقاعدہ تقرر جز وقتی لیکچرار کی حیثیت سے کر دیا گیا۔مجھے ڈپلوما کلاس کا کورس Subject Analysis پڑھانے کے لیے دیا گیا۔اس سال سیمسٹر سسٹم کا نظام رائج ہوگیا تھا۔شعبے میں میری پہلی کلاس ہوتی تھی۔میں علی الصبح نیو کیمپس میں واقع شعبے میں پہنچ جاتا تھا۔کلاس کو پہلا پیریڈ پڑھا کر واپس لائبریری (واقع اولڈ کیمپس) میں آجاتا تھا۔جس روز میری کلاس ہوتی تھی، میں اس روز لائبریری میں قریباً دو گھنٹے زائد بیٹھتا تھا تاکہ جو وقت میں نے تدریس اور آنے جانے میں گزارا ہے اس کی تلافی ہو جائے۔اگرچہ یہ بہت مشکل کام تھا، لیکن اس کی بجا آوری کی توفیق اللہ تعالیٰ نے عطا کر دی تھی۔ایک لیکچر کا معاوضہ شروع میں ۲۹/- روپے ملتا تھا۔بعد میں یہ چالیس روپے ہوگیا تھا۔اگرچہ تدریس کا معاوضہ کم تھا، لیکن یہ کام بہت اہم تھا اور اچھے استاد کی عزت بھی بہت تھی۔الحمدللہ، خداوند عالم نے مجھے اس اعزاز سے نوازا تھا۔انسان کو ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا شکر ہی ادا کرنا چاہیے۔شکر کی بجا آوری مکمل طور پر کوئی شخص ادا نہیں کر سکتا۔شیخ سعدیؒ نے کیا خوب کہا ہے:۔

از دست و زبانِ کہ بر آید
کز عہدۂ شکرش بدر آید

دو تین سمسٹر تک میں نے یہی کورس پڑھایا۔ بعد میں ہر ابر سال کورس تبدیل کر دیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں مشتاق احمد صاحب چیئرمین بن گئے تھے۔ ڈاکٹر ممتاز انور صاحب سعودی عرب چلے گئے تھے۔ جدہ میں مقیم تھے۔ بعد میں بشیر علی خان صاحب بھی سعودی عرب چلے گئے۔ مشتاق احمد صاحب کیلئے کل وقتی استاد تھے اور شعبہ کے چیئرمین بھی۔ بشیر صاحب کے سعودی عرب جانے سے پہلے ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے میری مصروفیات میں ازحد اضافہ کر دیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے یہ کام کرنا پڑا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ بشیر علی خان صاحب شعبہ کے چیئرمین تھے۔ ایک کورس پڑھانے کے لیے ایک جز وقتی استاد کی مزید ضرورت تھی۔ ملک صاحب نے مجھے کہا کہ آپ ایک اور کورس پڑھائیں۔ میں نے معذرت کر لی کہ اگر میں دو کورسز پڑھاؤں تو مجھ پر کام کا بوجھ بہت زیادہ ہو جائے گا۔ مجھے صبح گھر سے نکلنا ہوگا اور شام کے وقت گھر لوٹنا ہوگا۔ گھر کے افرادِ خانہ کی ذمہ داریاں بھی مجھ پر ہیں۔ میری دو چھوٹی بچیاں ہیں۔ گھر کے دیگر کاموں کو بھی ادا کرنا ہوتا ہے۔ میں یہ وضاحت کر کے واپس لائبریری میں اولڈ کیمپس آ گیا۔ لائبریری کے سامنے پرانے لا کالج کا ٹینس لان تھا۔ اس کی ایک جانب لائبریری کی پرانی بلڈنگ تھی اور دوسری جانب یونیورسٹی پریس کی پرانی عمارت تھی۔ میں لائبریری کی جانب لان میں کھڑا تھا، میں نے دیکھا کہ بشیر علی خان صاحب تیز تیز چلتے ہوئے آ رہے ہیں۔ آتے ہی مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہنے لگے: شاہ صاحب! آپ کو ایک اور کورس پڑھانا ہی ہوگا۔ میں نے پھر وہی وضاحت کی۔ کہنے لگے: کوئی ایسا نام بتائیں جو یہ کورس پڑھا سکے۔ ہم ہر ایم اے پاس کو یہ کام نہیں دے سکتے۔ آپ یہ ذمہ داری اٹھائیں۔ ملک صاحب نے اب اس انداز سے بات کی کہ میں انکار نہ کر سکا۔ میں نے ملک صاحب سے کہا کہ ٹھیک ہے میں یہ بوجھ اٹھا لیتا ہوں لیکن اس سے میری زندگی بہت "مشینی" ہو جائے گی۔ بہرحال میں نے چند ماہ کے لیے یہ ذمہ داری قبول کر لی۔ اگرچہ اتنا بوجھ (Work load) اٹھانا انتہائی مشکل تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی توفیق عطا کر دی۔ اس وقت مجھے غالب کا یہ شعر یاد آ رہا ہے:۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

فارسی کے اس شعر کا بھی یہی مضمون ہے:۔

مشکلی نیست کہ آسان نشود
مرد باید کہ ہراسان نشود

عربی زبان میں کہا جاتا ہے: السعی منی والتوفیق من اللہ ۔ یعنی کوشش میری طرف سے ہے اور توفیق اللہ تعالیٰ کی جانب سے ملتی ہے۔ عزمِ صمیم اور ارادہ صادق ہو تو تائید ایزدی سے ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔

اب پھر کورسز کی تدریس کی طرف لوٹتا ہوں۔ بعد میں مجھے انسانیات (Humanities) کا کورس بھی دیا گیا۔ اس کو میں نے پڑھایا۔ یہ میری دلچسپی کا موضوع تھا۔ میرا تعلیمی پس منظر بھی اسی حوالے سے تھا۔ یہ کورس پڑھانے میں میرے لیے نہ صرف آسانی رہی بلکہ دلچسپی بھی برقرار رہی۔ اس کے بعد مجھے ایم اے کی کلاس کو جامعاتی لائبریری کا نظم و نسق (Administation of University Library) بھی پڑھانا پڑا۔ میری سروس کا پس منظر بھی اسی حوالے سے تھا۔ یہ کورس میں نے ایم اے میں رحیم صاحب سے پڑھا ہوا بھی تھا۔ پھر میں نے کلیاتی کتب خانے کا انتظام و انصرام (Admiistaration of College Library) کا کورس پڑھایا۔ اس کو پڑھانے میں بھی کوئی مشکل پیش نہ آئی۔

اس کے بعد ایک سال کے لیے میں نے "اصول تحقیق" (Research Methodology) کا کورس پڑھایا۔ مجھے اس

کورس کے پڑھانے میں شعوری طور پر بہت دلچسپی رہی۔ میں نے اصول تحقیق پر اردو میں ایک کتاب لکھنے کا منصوبہ بنایا اور اردو میں اس موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں کا جائزہ لیا۔ مجھے ہر کتاب کے مندرجات کسی ایک شعبۂ علم (Discipline) تک محدود نظر آئے۔ اردو میں لکھی جانے والی کتب کا تعلق بالعموم اردو ادبیات کے ساتھ تھا۔ انسانیات (Humanities) اور معاشرتی علوم (Social Sciences) کے متعلق یہ کتابیں نہیں تھیں۔ اردو میں چھپنے والے مضامین (Articles) کا بھی یہی حال تھا۔ اس کے علاوہ میں نے محسوس کیا کہ یہ موضوع بہت تکنیکی نوعیت کا ہے۔ گولڈر (Goldhor) کی کتاب طلبہ ہاتھ میں پکڑ کر میرے پاس آتے تھے اور کہتے تھے کہ اس پیراگراف کا مطلب کیا ہے؟ بالفاظ دیگر ان کو اس تکنیکی زبان کو سمجھنے میں بھی دقت محسوس ہوتی تھی۔ میں نے ان کی اس مشکل کو محسوس کیا۔ ان سب عوامل نے مل کر میرے لیے یہ فیصلہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا کہ اردو زبان میں اصول تحقیق پر ایک ایسی کتاب لکھی جائے جو نہ صرف لائبریری سائنس کے طلبہ کے لیے مفید ہو بلکہ ''انسانیات'' اور ''معاشرتی علوم'' کے بعض علمی شعبوں کے طلبہ کے لیے بھی قابل استفادہ ہو۔ چنانچہ میں نے کلاس کو یہ کورس اس انداز سے پڑھایا کہ میں پہلے لیکچر کو اردو میں لکھ لیتا تھا، پھر کلاس روم میں جا کر زیر نظر پہلو پر لیکچر دیتا تھا۔ ہر پہلو کو بہت تفصیل کے ساتھ زیر بحث لایا جاتا تھا۔ طلبہ کی دلچسپی بھی اس کورس میں بڑھنے لگی بلکہ ان کی بھرپور شرکت دیکھی جانے لگی۔ الحمدللہ، یہ نیا کورس میں نے ایک تعلیمی سیشن میں نہ صرف پڑھایا، بلکہ ''لائبریری سائنس اور اصول تحقیق'' کی کتاب کا ابتدائی مسودہ بھی تیار ہو گیا۔ اس مسودے میں سے چند مضامین اردو کے مؤقر رسائل میں شائع بھی ہوئے۔ اسی زمانے میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری صاحب بھی کورس ایم۔اے اردو کلاس کو یونیورسٹی اورینٹل کالج میں پڑھاتے تھے۔ کبھی کبھار ہم دونوں اولڈ کیمپس میں واقع یونیورسٹی کیفیٹریا میں اکٹھے چائے پیتے تھے۔ اس دوران ہم اس موضوع پر تبادلۂ خیالات بھی کرتے تھے۔ ایک دوسرے کے ساتھ بعض نکات کے متعلق علمی مشاورت بھی کرتے تھے۔ اولڈ کیمپس میں ایک علمی اور تحقیقی ماحول بن گیا جس کی وجہ سے ''اصول تحقیق'' کی اردو اصطلاحات کو سمجھنے اور لکھنے میں آسانی ہو گئی۔

اس کتاب کی اشاعت کا پس منظر یہ ہے کہ ایک روز ڈاکٹر وحید قریشی (م ۲۰۰۹ء) اورینٹل کالج میں سید محمد اکرم اکرام، صدر شعبۂ اقبالیات کے دفتر میں بیٹھے تھے۔ میں بھی وہاں موجود تھا۔ باتوں باتوں میں اس کتاب کے مسودے کا ذکر ہوا۔ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے کہا کہ اس مسودے کو آپ حتمی شکل دیں اور مجھے اسلام آباد بھیج دیں۔ اس کو مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کی طرف سے شائع کیا جائے گا۔ اس وقت ڈاکٹر صاحب مقتدرہ کے صدر نشین تھے۔ میں نے کہا ابھی اس مسودے پر کچھ کام کرنے والا ہے۔ اس کتاب کا عنوان بھی ابھی فائنل نہیں کیا۔ کہنے لگے کہ اس کا عنوان رکھیں: ''لائبریری سائنس اور اصول تحقیق''۔ چنانچہ میں نے جلد ہی اس مسودے کو حتمی شکل دے دی اور اس کو اسلام آباد ڈاکٹر صاحب کے پاس بھیج دیا۔ انہوں نے اس مسودے کو کسی ماہر کو دکھائے بغیر ۱۹۸۷ء میں شائع کر دیا۔ اور اس کے عنوان کے ساتھ قوسین میں تسویدی ایڈیشن لکھ دیا۔ چند سال کے بعد یہ کتاب مقتدرہ نے دوبارہ شائع کی۔ اس وقت ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب مقتدرہ کے صدر نشین تھے۔ بفضل خدا یہ کتاب ماہرین نے بہت پسند کی۔ ڈاکٹر ممتاز انور صاحب اور ڈاکٹر انیس خورشید مرحوم نے اس پر تبصرے لکھے تھے۔ ان میں اس کتاب کی تعریف کی گئی تھی۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد نے ''انسانیات'' اور ''معاشرتی علوم'' کے بعض علمی شعبوں میں کام کرنے والے طلبہ/محققین کے لیے اس کتاب کا مطالعہ کرنے کی سفارش کی ہے یعنی یہ ان کی نصابی کتب میں شامل ہے۔ یہ شعبہ لائبریری سائنس میں تدریس کا نتیجہ ہے جس کی وجہ سے اس کتاب کے مسودے پر کام کیا گیا۔

اب پھر تدریس کی طرف لوٹتا ہوں۔ آخری چند سالوں میں مجھے ایک ایسا کورس پڑھانے کے لیے دیا گیا جس میں سیمسٹر سسٹم کے تین کورسز اکٹھے کر دیے گئے تھے۔ اس کورس کا ٹائٹل یہ تھا: Resources in Humanities, Social Sciences & Science and Technology. اس کورس کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ بہرحال میں اس کو پڑھاتا رہا۔

شعبہ میں تدریس کے عرصہ کے دوران مجھے تحقیقی راہنمائی کا کام بھی سونپا گیا۔ میں نے چار مقالات (Theses) کی نگرانی اور

راہنمائی کا فریضہ سرانجام دیا۔مقالے کا عنوان، مقالہ نگار اور سال تحقیق کی معلومات ذیل میں دی جاتی ہیں:۔

۱۔کیٹلاگ کارڈ ترتیب دینے کے لیے اسایل اے قواعد کا اردو ترجمہ مع اردو امثال قواعد ۱ تا ۲۵: محمد حنیف مرزا، ۱۹۸۰ء۔

۲۔کیٹلاگ کارڈ ترتیب دینے کے لیے اسایل اے قواعد کا اردو ترجمہ مع اردو امثال قواعد ۲۶ تا ۲۷: محمد ظفر ڈاہر، ۱۹۸۰ء۔

۳۔پنجاب میں کلیاتی کتب خانوں کا نظم ونسق: رانا جماعت علی خاں، ۱۹۸۱ء۔

۴۔پنجاب یونیورسٹی لائبریری، تاریخی جائزہ: بلقیس بیگم، ۱۹۸۲ء۔

ان مقالات کی راہنمائی کرتے ہوئے مجھے اصول تحقیق کے عملی اطلاق کا تجربہ ہوا۔مقالہ نگاروں کی محنت کا بھی اندازہ ہوا۔رانا جماعت خاں صاحب کا مقالہ (Thesis) بہت ضخیم ہے۔انہوں نے بہت زیادہ مواد اکٹھا کیا ہوا تھا۔اس کو مختصر کرنے کے بعد مقالے کی موجودہ ضخامت برقرار رہی۔میں نے رانا صاحب کو ماضی قریب کے چند سالوں میں تحقیقی کام کرتے ہوئے دیکھا ہے۔وہ بہت محنت سے کام کرتے ہیں۔۲۰۱۴ء اور ۲۰۱۵ء میں ان کی دو کتابیں: ''انوار نقشبند'' اور ''تحفظ انساب فی اصالت نسب'' شائع ہوئی ہیں۔(۷)

جب مشتاق احمد صاحب چیئرمین تھے، وہ ایک سال گرمیوں کی تعطیلات کے دوران ایک ہفتے کے لیے معروف تھے یا شاید کہیں باہر گئے تھے۔انہوں نے مجھے کہا کہ اس دوران آپ شعبے میں آ کر ڈاک وغیرہ دیکھ لیا کریں اور جو ضروری دفتری امور ہوں، وہ نمٹا دیا کریں۔ چنانچہ ایک ہفتے کے لیے میں یہ فرائض بھی انجام دیتا رہا۔اس مقصد کے لیے تھوڑی دیر کے لیے آنا تھا، ضروری امور نمٹا کر واپس لائبریری چلا جانا تھا۔اس کام کے لیے مجھے رسمی اجازت دی گئی تھی۔

یہ غالباً ۱۹۸۰ء کی بات ہے۔کلاس کا سٹڈی ٹور کراچی جانا تھا۔مشتاق احمد صاحب مجھے کہنے لگے کہ آپ بھی اس سٹڈی ٹور میں ہمارے ساتھ چلیں۔میں نے کہا کہ اس کے لیے یونیورسٹی انتظامیہ سے باقاعدہ منظور لے لی جائے۔اس وقت شعبے میں صرف مشتاق صاحب کیلئے ہی کل وقتی استاد تھے۔انہوں نے یونیورسٹی انتظامیہ سے تحریری منظور لے لی۔چنانچہ میں ایک استاد (جز وقتی استاد) کی حیثیت سے کلاس کے ساتھ کراچی گیا۔مشتاق صاحب بحیثیت چیئرمین شعبہ ہمارے ساتھ تھے۔یہ قریباً ایک ہفتے کا سٹڈی ٹور تھا۔اس زمانے میں کراچی کے حالات اچھے تھے۔کراچی کے مختلف مقامات کو دیکھا۔کلفٹن کی جانب سمندر کا نظارہ بھی کیا۔یہ سب کچھ دیکھ کر اپنے وطن عزیز کی عظمت کا احساس ہوا۔اللہ تعالیٰ نے کتنی نعمتوں سے ارض پاک کو نوازا ہے۔اس کے لیے اللہ رب العزت کا جتنا شکر ادا کیا جائے، کم ہے۔

میں نے اپنے گیارہ سالہ تدریس کے واقعات کو مختصر طور پر بیان کر دیا ہے۔شعبہ سے رسمی تعلق اٹھائیس سال پہلے ختم ہو گیا تھا۔ کاش کہ تدریس کی مدت کے دوران میں نے ڈائری لکھی ہوتی تو آج یہ اختصار تفصیل میں بدل جاتا۔لکھا ہوا محفوظ رہتا ہے جب کہ لکھنے والے کو کل کی امید نہیں ہوتی۔کسی فارسی شاعر نے اس حوالے سے کہا ہے:۔

نوشتہ بماند سیاہ بر سفید
نویسندہ را نیست فردا امید

اسی مضمون کو کسی عربی شاعر نے اس طرح بیان کیا ہے:۔

یلوح الخط فی القرطاس دھرا
و کاتبہ رمیم فی التراب

شعبہ کے ساتھ غیر رسمی تعلق اب بھی قائم ہے۔اس شعبہ کی بنیاد ۱۹۱۵ء میں آسا۔ڈان ڈکنسن نے رکھی۔اس سال (۲۰۱۵ء) اس کی صدی تقریبات منائی جا رہی ہیں۔شعبہ کی انتظامیہ کا یہ عمل مستحسن ہے کہ اس شعبہ کے سینئر فاضلین کو یاد رکھتی ہے اور مختلف تقریبات میں ان کو بلاتی

ہے بالخصوص شعبہ کی چیئرپرسن میڈم ڈاکٹر کنول امین صاحبہ کا رول قابلِ تعریف ہے کہ ان کی راہنمائی میں دیگر اساتذہ اور عملہ ان تقریبات کے حوالے سے بہت سرگرم عمل ہے۔ ان سب کی کاوش قابلِ ستائش ہے۔

۱۸۔ جون کی تقریب کے اختتام پر ڈاکٹر صاحبہ نے مجھے اور رانا جماعت علی خان صاحب کو رخصت کرتے ہوئے کہا کہ آپ اپنی یادوں اور تاثرات کو لکھیں۔ ایسے تاثرات مقالات/ مضامین ان شاء اللہ شعبہ کے جرنل کے خصوصی شمارے میں شائع ہوں گے۔ میں نے ایک اور تقریب میں ایسے مضامین لکھوانے کے لیے شعبہ کی جانب سے خط بھیجنے کی تجویز پیش کی تھی۔ اس کے پس منظر میں ڈاکٹر صاحبہ نے کہا کہ خط کا انتظار نہ کریں۔ بس لکھنا شروع کر دیں۔ میں نے از راہ مزاح کہا کہ اس ترغیب و تشویق کو ہم خط سمجھیں تو انہوں نے مسکرا کر کہا کہ ایسا ہی سمجھیں۔ مجھے ڈاکٹر صاحبہ کو ایم۔ اے میں پڑھانے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ ان کو یہ بات یاد ہے۔ ان کی اس ترغیب سے یہ "یادیں" لکھنے کی تحریک ہوئی۔

اس مادرِ علمی کے زیرِ حوالہ شعبہ نے اب قابلِ ستائش ترقی کی ہے۔ جب ہم بلانے پر شعبہ میں جاتے ہیں تو اس کی پر رونق فضا کو دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ اس میں علمی ترقی کا عمل بھی جاری ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس کی تحقیقی سرگرمیوں میں بھی اضافہ ہوتا رہے گا۔ موجودہ علمی فضا اس کے لیے بہت سازگار ہے۔ ایم۔ فل اور پی ایچ۔ ڈی کے طلبا/ محققین شعبہ لائبریری سائنس (موجودہ انفارمیشن مینجمنٹ) کا نام روشن کریں گے۔ امید ہے کہ اس کی باقاعدہ علمی تاریخ بھی لکھی جائے گی۔ ماضی کے واقعات کا نام تاریخ ہے۔ ان کو محفوظ کرنے سے مستقبل کی راہیں مزید روشن ہو جاتی ہیں اور ماضی کے واقعات سے مستقبل کے لیے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اس کے متعلق کہا ہے:۔

ضبط کن تاریخ را پایندہ شو
از نفسہائے رمیدہ زندہ شو

حواشی

۱۔ سید جمیل احمد رضوی، عبدالوہاب خاں سلیم (پیکرِ جود و عطا) (لاہور: ادارہ فروغ مطالعہ، ۲۰۱۲ء)، ص ۱۸۔۱۹۔

۲۔ سید جمیل احمد رضوی، "قاضی عبدالنبی کوکب مرحوم (۱۹۳۶ء۔۱۹۷۸ء)، معروف عالم اور ماہر فہرست ساز مخطوطات)"، مشمولہ پاکستانی لائبریرین، شمارہ ۲ (۱۹۹۶ء) ۷

۳۔ رحیم صاحب کے متعلق مزید معلومات کے لیے راقم السطور کا درج ذیل مضمون دیکھا جا سکتا ہے:۔

سید جمیل احمد رضوی، "عبدالرحیم (اے رحیم) مرحوم"، مشمولہ پاکستان جرنل آف لائبریری اینڈ انفارمیشن سائنس، ۱۲ (۲۰۱۱ء)

۴۔ سید جمیل احمد رضوی، لائبریری سائنس اور اصول تحقیق (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء)، ص ۸

۵۔ بشیر علی خاں، "پیش لفظ"، مشمولہ لائبریرین شپ کی عمرانی بنیادیں از جے۔ ایچ۔ شیرا، ترجمہ و تلخیص سید جمیل احمد رضوی (لاہور: پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن (پنجاب برانچ، ۱۹۸۰ء)، ص ق؛ ایضاً (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء)، ص ۱۸۔۱۹

۶۔ قاضی عبدالنبی کوکب مرحوم کے بارے میں دوسری معلومات میرے درج ذیل مضمون میں دیکھی جا سکتی ہیں:۔ سید جمیل احمد رضوی، "قاضی

عبدالنبی کوکب مرحوم)۔۔۔(۱۹۳۶ء۔۱۹۷۸ء)بحولہ بالا،ص۔۷۔۱۵

۷۔ان دو کتابوں کی کتابیاتی تفاصیل درج ذیل ہیں:۔

جماعت علی خاں نقشبندی مجددی، رانا۔انوار نقشبند۔لاہور: فیضان نقشبند پبلشرز،۲۰۱۴ء۔۳۴۴ص۔

"سوانح حیات مخزن علم وعرفان، معدنِ رشد وہدایت حضرت الحاج الحافظ پیر خواجہ غلام نقشبند فاروقی نقشبندی مجددی چوراہی قدس سرہ العزیز الموسوم بانوار نقشبند"(سرورق)

جماعت علی خاں نقشبندی مجددی، رانا۔تحفظِ انساب المعروف اصالت نسب غوث زماں قطب الاقطاب حضرت باباجی فقیر محمد چوراہی قدس سرہ العزیز۔لاہور: فیضان نقشبند پبلشرز،۲۰۱۵ء۔۳۲۹ص۔

-----------☆-----------